بہاولپور کے آثارِ قدیمہ اور ان کی تحقیق و نگہداشت کے لیے چند ناگزیر تجاویز

سیّد محمد آصف علی رضوی

تاریخی اور جغرافیائی ہر دو لحاظ سے بہاولپور کو پنجاب کے دوسرے ڈویژنوں کے مقابلہ میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ برطانوی ہندوستان میں شامل بہاولپور مسلمانوں کی دوسری بڑی ریاست تھی اور پاکستان میں شامل ہونے والی سب سے بڑی ریاست ہے[۱]۔ یہ ریاست چمکتے ہوئے لق و دق صحرا جو مسحور کن سرابوں کے ساتھ ساتھ سرسبز نخلستان اور شاداب کھیتوں کی سرزمین ہے۔ جس کی عظمت دیرینہ کے نشانات گھاگھرا کے خشک پاٹ کے کنارے قلعہ ڈیراور، مروٹ اور فورٹ عباس کے کھنڈرات ہیں۔ نیز جانڈا، کھانڈا، پھول ڈورہ، پتن منارہ سوئی وھار اور سرواہی کے آثارات عالمی انسانی ورثہ قرار دینے کے مستحق ہیں۔ علم و عرفان، فنون و حکمت اور دانش و آگہی کی روایات کے لحاظ سے سرزمین بہاولپور، عہد عتیق سے ہی درخشندہ روایات کی امین رہی ہے۔ یہاں ہندومت کی عظیم عبادت گاہیں بھی تھیں اور بدھ مت کی عالمی شہرت کی حامل درس گاہیں بھی، طلوع اسلام کے بعد اسی خطے میں واقع اُچ شریف اوّلین اسلامی علوم کا مرکز بنا اور صدیوں تک نسل انسانی کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا رہا[۲]۔

بہاولپور کا بطور ریاست قیام ۱۷۲۷ء میں عمل میں آیا اور امیر صادق محمد خان اس کے پہلے حکمران قرار پائے۔ جس کا تعلق بغداد کے خلفائے عباسیہ سے تھا۔ اس خاندان کے افراد کا قیام بغداد سے ہجرت کے بعد مختلف ادوار میں نہ صرف سندھ بلکہ موجودہ پنجاب کے کافی اضلاع میں مقیم رہا۔ بغداد چھوڑنے کے بعد اس خاندان کے افراد کا قیام مکران (بلوچستان) میں رہا۔ جہاں ان کی حیثیت مذہبی پیشواؤں کی تھی۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر جیمز بریئر کا کہنا ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں جن دو مذہبی رہنماؤں نے دریائے سندھ کے کنارے آباد مکینوں کی سیاست پر قبضہ کیا ان میں ایک آدم شاہ کلہوڑہ عباسی اور دوسرے سکھوں کے مرشد نانا صاحب تھے۔ آدم شاہ نے تفری اور بالائی سندھ میں سیاست کی افراتفری کا فائدہ اٹھایا اور وہاں کے حکمران بن گئے[۳]۔ یہ وہ دور ہے جب ۱۷۲۷ء میں نادر شاہ نے سندھ پر حملہ کیا۔

ڈاکٹر جیمز بریئر کے مطابق اس دوران ان کو شہنشاہ اورنگزیب سے ٹھٹھہ کی حکمرانی کا پروانہ بھی مل گیا[۴]۔ بعد ازاں عظیم مغل حکمران کی باہمی اقتدار کی جنگ کے اثرات اس خاندان میں بھی سرایت کر گئے۔ عباسی دو گروہوں میں بٹ گئے اور شہنشاہ امیر کلہوڑہ کی اولاد علاقہ سندھ پر قابض ہوگئی اور امیر داؤد خان کی اولاد سندھ سے نقل مکانی کر کے موجودہ بہاولپور کی حدود میں آگئی۔ اور ریاست کی بنا ڈالی جو ستمبر ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ کی تشکیل کے وقت ایک معاہدے کے ذریعے وحدت مغربی پاکستان میں بہاولپور ڈویژن کے نام سے مدغم ہوگئی (الف-۴)۔ صوبہ پنجاب میں واقع بہاولپور ڈویژن 28-1/2 ڈگری شمال عرض بلد سے لے کر تقریباً 30-1/2 ڈگری عرض بلد تک اور 69 ڈگری مشرقی بلد سے ۷۴ ڈگری مشرقی طول بلد تک غرباً تقریباً ۴۵۰ کلو میٹر طویل اور وسط میں شمالاً جنوباً پنجند سے لے کر اسلام گڑھ تک تقریباً ۱۷۵ کلومیٹر عرض میں پھیلا ہوا ہے[۵]، چنانچہ نقشہ پر اس کی شکل مشکیزہ نما نظر آتی ہے۔ شمال میں اس کی سرحد دریائے ستلج و پنجند و سندھ سے متعین ہوتی ہے جو ملتان اور ڈیرہ غازی خان ڈویژنوں کو اس سے جدا کرتی ہے اور جس سے متصل اضلاع ساہیوال، وہاڑی، ملتان، لودھران، مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان واقع ہیں جبکہ صوبہ سندھ کا سکھر ڈویژن اس کے عین مغرب میں ہے اور جنوبی جانب پاک و ہند کی بین الاقوامی سرحد کا نصف چھ کلومیٹر حصہ واقع ہے جو بھارت کے علاقہ راجھستان اور مشرقی پنجاب کو پاکستان سے جدا کرتا ہے اور اس طرح قومی دفاع و عسکری اعتبار سے نہایت اہم ہے۔

چودہ تحصیلوں اور تین اضلاع بہاولنگر، بہاولپور اور رحیم یار خان پر مشتمل اس کا کل رقبہ ۴۵،۵۸۸ مربع کلومیٹر ہے اور اس طرح بہ لحاظ رقبہ بہاولپور پنجاب کا سب سے بڑا ڈویژن ہے[۶]۔ آبادی سال ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی ۴۶۶۹۰۰۰ تھی جس کا تخمینہ ۶۸۲۳۰۰۰ نفوس لگایا گیا ہے۔ آبادی کا تقریباً ۸۰ فیصد دیہاتوں میں آباد ہے۔ سال ۱۹۶۱ء سے سال ۱۹۸۱ء تک کی آبادی کی اعداد و شمار کے موازنہ سے شرح آبادی کا اندازہ

ایک لاکھ نفوس لگایا گیا ہے لیکن گزشتہ دس گیارہ برسوں میں اس میں غیر معمولی اضافہ تقریباً دو لاکھ چھبیس ہزار نفوس کی رفتار سے ہوا ہے جس کے مطابق اس وقت کل آبادی تقریباً ۶۹ لاکھ ہو گئی۔ بہاولپور ڈویژن کی سطح بیشتر حصہ دریائے سندھ کے طاس کا وسطی میدانی علاقہ ہے جو سطح سمندر سے تقریباً ۱۵۰ میٹر سے زیادہ بلند نہیں ہے البتہ جنوب مغربی صحرائی علاقہ میں جس کو مقامی زبان میں روہی چولستان کہتے ہیں ریت کے وسیع طویل و عریض ٹیلوں نے ہموار سطح کو غیر سطح نشیب و فراز سے تبدیل کر دیا ہے۔ جن کی بلندی ڈیڑھ سو میٹر سے تجاویز کر جاتی ہے۔

سطح کے حوالے سے بہاولپور ڈویژن کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، یعنی شمالی حصہ جو دریائے ستلج کا کھادریا سیلابی کنارہ ہے یہاں دریا برُدہ زرخیز سیلابی خاک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ پرانی آبادی کا علاقہ ہے اس علاقے کو مقامی زبان میں اومار بھی کہتے ہیں۔ سطح کے لحاظ سے دسرا حصہ ریلوے لائن اور گزرگاہ ہاکڑہ کے درمیان پھیلا ہوا ہے جو عموماً صحرائی ریت اور چکنی مٹی کے سخت میدانوں پر مشتمل ہے سیلابی خاک کے علاوہ ہوا بُردہ صحرائی ریت اس کی سطح کے خاص اجزا ہیں مقامی زبان میں اس علاقہ کو ھٹھار کہتے ہیں۔ بہ لحاظ سطح بہاولپور کا تقریباً دو تہائی جنوبی حصہ صحرائے راجپوتانہ کا شمالی حصہ ہے جہاں ریت کے بڑے بڑے یعنی متحرک ٹیلے دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے شمالی جانب ویدک زمانہ کے ایک مشہور دریا سرسوتی کی پرانی گزرگاہ کے نشانات ملتے ہیں۔ اس دشت میں ایک شہر تھا وہ کیا ہوا کسی گم شدہ دریا کے متعلق ماہرین طبقات الارض کے تین مختلف نظریات ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ دریائے ستلج کا جنوبی معاون تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ بذات خود ایک علیحدہ دریائی نظام تھا جو خلیج رن کچھ میں جا گرتا تھا اور تیسرے نظریے کے مطابق سندھ کے دریائے تارا کا بالائی حصہ تھا بہر حال اس کے معدوم ہونے کی وجہ پر سب متفق ہیں کہ یہ ہمسایہ دریائے جمنا جس کا سرچشمہ اس کے منبع کے قریب ہمالیہ میں ہے اپنے تخریبی عمل سے اس کے معاونین کو اپنی طرف منتقل کر لیا۔ جغرافیہ کی اصطلاح میں اس مظہر قدرت کو دریا گیری کہا جاتا ہے۔ اس کے ویدک نام سرسوتی کے علاوہ اب اس کو دریائے ہاکڑہ یا دریائے گھاگرہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ آج بھی یہ ایک برساتی ندی کی شکل میں بھارت کے علاقہ بیکانیر میں داخل ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کا پانی بہاولپور میں داخل ہو جاتا ہے جو ضلع بہاولنگر کی نو آبادیوں کو متاثر کرتا ہے[۸]۔ اصولاً محل وقوع کا آب و ہوا پر گہرا اثر ہوتا ہے لیکن بہاولپور ڈویژن گرم قدرتی خطہ سے شمالی جانب واقع ہونے کے باوجود صحرائے راجپوتانہ سے متصل ہونے کی وجہ سے مجموعی طور پر نیم صحرائی گرم خشک آب و ہوا کا حامل ہے۔ ماہ مارچ سے اکتوبر تک تقریباً آٹھ ماہ موسم گرم رہتا ہے البتہ نومبر سے فروری تک موسم نسبتاً سرد اور خوشگوار ہوتا ہے۔ موسم گرما میں اوسط درجہ حرارت ۳۰ تا ۳۵ ڈگری سینٹی گریڈ اور موسم سرما میں ۱۰ سے ۱۵ ڈگری سینٹی گریڈ ہوتا ہے جبکہ اوسط سالانہ درجات حرارت ۲۴ ڈگری سینٹی گریڈ سے ۲۶ ڈگری سینٹی گریڈ تک رہتا ہے[۹]۔ دن اور رات میں معتدبہ تفاوت پایا جاتا ہے جو موسم سرما میں رات کے وقت بعض اوقات نقطہ انجماد سے بھی گر جاتا ہے اور پالا پڑ جانے کا باعث بنتا ہے جس سے فصلیں خراب ہو جاتی ہیں۔ موسم کے جون اور جولائی کے مہینوں میں دن کے وقت تمازتِ آفتاب میدان حشر بپا کرتی ہے جبکہ فورٹ عباس اور خانپور کا درجہ حرارت بعض اوقات ۴۵ ڈگری سینٹی گریڈ سے بھی تجاوز کر کے جیکب آباد کے ہم پلہ ہو جاتا ہے اور آندھیوں کا باعث بنتا ہے۔ جہاں تک بارش کا تعلق ہے سالانہ اوسط ۱۰ سے ۲۵ سینٹی میٹر سے زائد کہیں نہیں ہے۔ موسم گرما میں اوسط بارش ۲۰ سینٹی میٹر اور موسم سرما میں صرف ۵ سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ جولائی اور اگست کے مہینوں کو موسم برسات کہا جاتا ہے، جبکہ شمالی پنجاب سے آنے والی بچی کھچی مون سون ہوائیں کبھی کبھی اس علاقے کے کم دباؤ کی طرف چلی آتی ہیں اور بارش برساتی ہیں شمالی مشرق سے جنوب کی سمت قلتِ باران بڑھتی جاتی ہے اس لیے صحرائے چولستان میں واقع بعض مقامات ایسے بھی ہیں جو سالہا سال قطرہ باران کو ترس جاتے ہیں۔ یہ علاقہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال پہلے سے متمدن اور تہذیب یافتہ تھا۔ کیونکہ اس علاقے میں پانچ ہزار سال پہلے کی ھاکڑہ تہذیب کے نشانات ملتے ہیں جو موہنجودڑو اور ہڑپہ کے دور سے بھی قبل کی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس ڈویژن کے اٹھارہ ہزار مربع میل رقبہ میں تقریباً دو تہائی لق و دق صحرا ہے جس کو چولستان کہا جاتا ہے۔ لفظ چولستان دراصل ترکی لفظ چیلستان ہے۔ جس سے مراد صحرائے بے آب کے ہیں۔ اس میں شدت کی گرمی پڑتی ہے۔ جو صحرائے اعظم کی سی تمازت کی ہمسری کرتی ہے۔ بادسموم ہر چیز کو جھلسا دیتی ہے اور تند و تیز ریت کے تودے دور دور تک منتقل کر جاتی ہے۔ سالانہ برسات برائے نام یعنی (تین انچ) ہوتی ہے۔ مگر ہزاروں سال پہلے یہ سرزمین دریاؤں کے مد و جز کی تماش گاہ

اور موج ہائے تلاطم کی جولاں گاہ رہی ہے۔ یہاں گھنے جنگلات اور سرسبز چراگاہیں تھیں اور ہر طرف فصلوں کے کھیت اور کھلیان نظر آتے تھے۔ اس زمانے میں یہاں تقریباً ۳۰ فیصد سالانہ بارش ہوا کرتی تھی[۱۰]۔

خطہ بہاولپور اپنی تاریخی و جغرافیائی اہمیت کے اعتبار سے سیاحین کے لیے بھی ہمیشہ وجہ کشش رہا ہے اور ایسے مشہور زمانہ سیاح جنھوں نے برصغیر کے مختلف علاقوں کی سیاحت کی ہے انھوں نے اس خطے میں بھی قدم رکھے ہیں اور یہاں کے ثقافتی معاشی اور سیاسی پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے تاثرات کتابی صورت میں شائع کیے ہیں۔ ان سیاحوں کی بہاولپور میں آمد کا سلسلہ قبل از مسیح سے شروع ہو کر زمانہ حال تک جاری رہتا ہے۔ سب سے پہلا سیاح جو یہاں آیا وہ نرچیس(Mr. Nurchhs) تھا جو سکندر اعظم کا درباری تھا جس نے اس خطے سے سکندر مقدونی کی فتوحات کا ذکر اپنے سفر نامہ میں کیا ہے۔ وہ پانچ دریاؤں کا تذکرہ کرتا ہے جن کے سنگم کے قریب سکندر اعظم نے قیام کیا تھا یہ جگہ اوچ شریف تھی جس کا نام اس نے اپنے نام پر اسکندریہ رکھا تھا[۱۱]۔ یونانی کتابوں میں سکندر کے نان سے جو شہر ملتے ہیں ان میں ایک نام اوچ شریف کا بھی ہے جسے سکندر نے اپنے نام سے منسوب کیا ہے۔ اس کے بعد جس مشہور سیاح کے آمد کا پتہ چلتا ہے وہ چینی سیاح ہیون سانگ ہے جو ساتویں صدی عیسوی میں اس علاقے کی سیاحت کرتا ہے[۱۲]۔

سیّدعلی بن حسین ایک ترک سیاح تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بڑی خوبیوں سے نوازا تھا وہ ملاح بھی تھا شاعر بھی، مورخ بھی اور سپاہی اور جغرافیہ دان بھی۔ اس کی سندھ، پنجاب، افغانستان، خراسان اور ایران کی سیاحت چار برسوں کے عرصے پر محیط ہے۔ اس نے اپنے سفر کی روداد مراہ الممالک میں درج کی ہے۔ جس میں وہ اس علاقے کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتا ہے[۱۳]۔ تاریخ اسلام ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر شہرت دوام حاصل کرنے والا ابو عبداللہ محمد المعروف ابن بطوطہ آٹھویں صدی ہجری میں سندھ سے ہوتا ہوا اوچ آیا۔ وہ اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے بکھر سے چل کر ہم اوچ میں پہنچے یہ شہر دریائے سندھ کے کنارے آباد ہے اور بڑا شہر ہے۔ بازار بہت عمدہ اور عمارتیں بہت مضبوط ہیں۔ میں اوچ میں حضرت جلال الدین حیدر علوی مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے بھی ملا جنھوں نے مجھے خرقہ عطا کیا[۱۴]۔

مذکورہ بالا سیاح اس زمانے میں آئے جب ریاست بہاولپور کی بنیاد نہیں پڑی تھی اس لیے ان تحریروں سے بطور خاص بہاولپور کے تہذیبی و ثقافتی حالات پر روشنی نہیں پڑتی۔ البتہ ان کے بعد جو انگریز سیاح وقتاً فوقتاً بہاولپور آئے ان کے سفر نامے کافی جاندار اور مفصل ہیں۔ ان سیاحوں میں ایک بہت ہی معتبر سیاح چارلس مین[15] تھا جس نے بہاولپور کا دورہ کیا۔ یہ اینگلو انڈین تھا اور یہ بھلوہ، جام گڑھ، میر گڑھ اور موج گڑھ ہوتا بہاولپور پہنچا۔ یہ خود لکھتا ہے ''ایشیا میں بہت کم ایسے شہر ہیں جہاں کی پیداوار اور مصنوعات اتنی وافر اور سستی ہیں جتنی بہاولپور میں[۱۶]۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ دریائے گھارا کی آبپاشی نے اس علاقے کو بہت زرخیز بنا دیا ہے، بہاولپور کے بارے میں وہ بتاتا ہے ''دریائے گھارا سے یہ شہر دو میل کے فاصلے پر آباد ہے اور یہاں کے مکانات پکی اینٹوں سے تعمیر شدہ ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ باغات پائے جاتے ہیں۔ خصوصاً کھجوروں اور پیپل کے درخت، اوچ کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ یہ اس علاقے کا قدیم ترین قصبہ ہے۔ یہ شہر دو ناموں سے موسوم ہے۔ ان میں سے ایک پیر کا اوچ کے نام سے مشہور ہے۔ اس نام کی وجہ میر ناصر الدین ہیں جو خان آف بہاولپور کے روحانی پیشوا ہیں[۱۷]۔ لیفٹیننٹ آرتھر کنالی ۱۸۳۸ء میں آیا اس نے بہاولپور کے متعلق اپنے سفر کے حالات اپنی مشہور کتاب کی جلد دوم میں بیان کیے ہیں۔ وہ روہڑی سے ہو کر بہاولپور پہنچا۔ وہ لکھتا ہے کہ جونہی ہم بہاولپور کے علاقے میں داخل ہوئے تو ہمیں کافی خوشحالی نظر آئی۔ کاشتکاری بہتر تھی، گندم فراوان،لوگ مہذب اور نظم و ضبط کے تابع معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے خان (نواب صاحب) کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں[۱۸]۔ ماونٹ سٹیوارٹ الفسٹن ۱۸۰۸ء میں نواب بہاول خان دوم کے عہد میں آیا۔ بہاولپور گزیٹر میں اس سیاح کے بارے میں لکھا ہے کہ مسٹر الفسٹن ۱۸۰۸ء میں نواب بھاول خان دوم کے عہد میں کابل جاتے ہوئے بہاولپور ٹھہرے اور نواب صاحب نے ان کی آمد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک معاہدے کے ذریعہ برطانوی حکومت سے تعلقات استوار کیے''۔ اس سفر نامے کی قابل تعریف بات یہ ہے کہ ان کے سفرنامے کے تاریخی شواہد بہت مضبوط ہیں اور ان کا تجزیہ بہت حقیقت پسندانہ ہے۔ اس کے باوجود کہ اتنے سال گزر گئے ان کی تحریر کے حقائق کو اب تک جھٹلایا

نہیں جا سکا اس وقت کے بہترین تاریخ دانوں مثلاً میجر راورٹی وغیرہ نے اس سفر نامے کی تعریف کی ہے اور اس کے تاریخی پس منظر کو سراہا ہے[۱۹]۔ لیفٹیننٹ کرنل سر الیگزینڈر بھی بہاولپور کا ایک اہم سیاح ہے۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا۔ جو دو دفعہ بہاولپور آیا اس نے اپنے سفر کے مشاہدات میں جلدی میں مرتب کیے ہیں۔ پہلی دو جلدوں کا نام کابل ہے اور تیسری کا نام "A Voyage of Sindh" تھا[۲۰]۔

لیفٹیننٹ اے۔ایچ بولیو سیاح بہاولپور میں ۱۸۳۵ء میں آیا۔ اس کا سفر نامہ ۱۸۳۷ء میں شائع ہوا وہ بہاولپور کے جن مقامات پر گیا ان میں اسلام گڑھ، خانپور، احمد پور، مٹھن کوٹ، اوچ ڈیرا بہاولپور، موج گڑھ، غوث گڑھ اور دکن پور وغیرہ شامل ہیں[۲۱]۔ موہن لال کشمیری بہاولپور میں ۱۸۳۶ء میں آیا وہ بہاولپور کا سیاح بھی ہے اور مورخ بھی اس کے سفر کے تاثرات کی یاداشتیں امپریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ نئی دھلی اور پنجاب ریکارڈ آفس لاہور میں بھی محفوظ ہیں۔ بہاولپور کی تاریخ پر اس کے دو مضمون ہیں جو جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں شائع ہو چکے ہیں جس میں نواب بہاولپور، ریاست کا قیام اور اوچ کے حالات بیان کیے گئے ہیں[۲۲]۔ ڈیوڈ راس بہاولپور کا ایک اور اہم سیاح ہے جو ۱۸ ویں صدی میں یہاں آیا اس نے پنجاب اور سندھ پر ایک معرکتہ الارا کتاب لکھی۔ سفر ناموں میں یہ کتاب کلاسک کا درجہ رکھتی ہے اور آج بھی سند مانی جاتی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ بہاولپور کے بارے میں جو خاص باتیں اس نے لکھی ہیں ان میں چولستان کے ایک قدیم شہر کے متعلق وہ لکھتا ہے، وجنوٹ (بجنوٹ) سندھ کے شہر برہمن آباد کا ہمعصر تھا یہ وہی شہر ہے جسے مشہور چینی سیاح ہیوان سانگ نے بھی مشن پولو کہا ہے اور یہ ساتویں صدی میں صوبے کا دارالحکومت تھا۔ چولستان کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ ''چولستان کا تحقیقی سروے بہت کم کیا گیا ہے وہاں بہت سے پرانے کھنڈر ہیں جن کے کنارے پر دریا بہتے تھے۔ اور جو اب ریت سے ڈھک چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب اس خطے کی زیادہ چھان بین کی گئی تو یہاں آثار قدیمہ کے بے شمار جواہر پارے ملیں گے[۲۳]۔ میجر میکین نے ۱۸۴۴ء میں بہاولپور کا دورہ کیا تھا جس کا مقصد سرسہ سے لے کر بہاولپور تک تجارتی مقاصد کے لیے اس راستے کی افادیت معلوم کرتا تھا، یہ وہی میجر میکین ہے جو کچھ عرصہ کے لیے بہاولپور کا پولیٹیکل ایجنٹ بھی رہا۔ اور جس کا ذکر منشی موہن کشمیری نے اپنے سفر نامے میں کیا ہے۔ میجر کی رپورٹ جنرل آف ایشیاٹک سوسائٹی میں شائع ہو چکی ہے[۲۴]۔ ان عظیم سیاحوں کے مشاہدات اور دیگر ماہرین تہذیب وتمدن اور آثار قدیمہ پر دسترس رکھنے والوں کی تخلیقات کی روشنی میں یہ امر واضح ہوتا ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب ایک شہری تہذیب تھی جو آج سے چار ہزار سال پہلے اپنے عروج پر تھی۔ اور آج سے تقریباً ۵۰ سال پہلے سندھ میں واقع موہنجوداڑو اور پنجاب کے شہر ہڑپہ کے مقام پر کھدائی پر یہ تہذیب اہل علم وفکر پر آشکار ہوئی۔ اور اس پہلو کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہ رہا کہ کم از کم یہ تہذیب سندھ سے لے کر پنجاب کے شہر ہڑپہ تک پھیلی تھی جس کا قلب بہاولپور تھا۔ کیونکہ ماہرین تہذیب وتمدن کے نزدیک یہ امر ناممکن ہے کہ کسی بھی بلند پایہ تہذیب کے دو شہر ایک دوسرے سے سینکڑوں میل دور الگ الگ ارتقاء پذیر ہوں اور درمیانی علاقہ اس طاقتور تہذیب سے کلیتاً آزاد ہو۔ نیز ان شہروں کا تمدنی نظام، معاشرتی روایات اور طرز تعمیر سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی ہے کہ ان دو تین شہروں کی ہمہ جہتی ترقی ایک ہی تہذیب کی مرہون منت ہے جس کا قلب بہاولپور ہے۔ یہ دو شہر نہیں بلکہ اس قسم کے دو بازو ہیں جس کے وجود کی بہاولپور میں نمو ہوئی ہے۔ وہ تہذیب جس کی نمو بہاولپور میں ہوئی۔اس کی ثقافت نہایت معیاری تھی۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو بہت سلیقہ سے بسائے گئے تھے، پکی سڑکیں اور ایک دوسرے سے زاویہ قائمہ پر تھیں۔ نکاس آب کا نظام نہایت اعلیٰ درجہ پر تھا اور حفظان صحت کے اصولوں کو مدنظر رکھا گیا تھا[۲۵]۔

قدیم صحائف اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ وادی سندھ ان علاقوں میں سے ہے جہاں انسانی تہذیب کی اولین نمو ہوئی۔ زرتشت کی مقدس کتاب ''اوستا'' میں لکھا ہے کہ ہرمزد نے انسان کی اولین آبادی کے لیے جس سرزمین کو پسند کیا وہ سات دریاؤں کی سرزمین تھی[۲۶]۔ یہ بات تو کسی ثبوت کی محتاج نہیں رہی کہ سندھی تہذیب کے بعد آریائی تہذیب نے بھی اس علاقے میں جنم لیا اور درمیان کے سنگم پر اس تہذیب کے بڑے بڑے شہر آباد ہوئے۔ سات دریاؤں کی سرزمین جس کو سندھ کہا جاتا ہے، کے تین دریاؤں کے بڑے بڑے سنگم بالعموم ان علاقوں میں واقع ہیں جو آج کل بہاولپور ملتان ڈویژن میں واقع ہے۔ اس ضمن میں سپنت، سندھو کے ان دو دریاؤں کو جو خشک ہو چکے ہیں میں ایک دریائے ہاکڑہ کی گزرگاہ کو مدنظر رکھا جائے تو

یہ پہلو اجاگر ہوتا ہے کہ آریا تہذیب کا مرکز بھی جنوبی پنجاب کا یہی علاقہ تھا۔ تاریخ کی ابتدائی ورق گردانی سے بھی یہی حقیقت آشکار ہوتی ہے۔ سکندر اعظم کا حملہ ۳۲۶ ق۔م کا واقعہ ہے۔ اس نے ایشیا کے ایک بڑے حصے کو فتح کیا جس میں پنجاب کا بالائی حصہ بھی شامل تھا، لیکن اس نے اپنے نام سے جو شہر منسوب کیا ہو بہاولپور کا علاقہ اوچ کی سرزمین پر تھا۔ کیونکہ دریاؤں کے سنگم کا یہ علاقہ انسانی آبادی اور اعلیٰ تہذیب کا حسین مرقع تھا۔ اوچ میں وہ انفرادیت و یگانگت تھی جو سکندر کو پورے ایشیا میں کہیں نظر نہیں آئی۔ سکندر کے حملے کے وقت اس علاقے کی اہمیت ایک اور پہلو سے اجاگر ہوتی ہے کہ اوچ سے آگے سکندر جب پتن منارا (موجودہ رحیم یار خان) میں داخل ہوا تو ہو اس علاقے کے حسن و جمال انسانی بستیوں کے تمدنی ارتقائی مدارج اور انتظامیہ کے نظم ونسق سے اس حد تک متاثر ہوا کہ اس کے ہمرکاب یونانی اہل قلم اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت یہ سرزمین دریاؤں کی تماش گاہ اور موج ہائے تلاطم کی جولانگاہ تھی۔ یہاں جنگلات، زرخیز زمین اور وسیع وعریض چراگاہیں تھیں۔ چار طرف قیمتی فصلیں، نفع آور کھیت وکھلیان اور جانوروں کے بڑے بڑے ریوڑ تھے۔ اور سب سے بڑھ کر گنجان آباد بستیاں جو شستہ انسانوں، فلاح و بہبود کے حامل معاشرتی نظاموں اور انسان دوست تہذیبوں سے مزین تھیں[۲۷]۔

بہاولپور ڈویژن کے اٹھارہ ہزار مربع میل رقبہ میں سے دو تہائی لق و دق صحرا ہے جو بھارت کی سرحد راجھستان کے ساتھ متوازی چلا گیا ہے جس کو ''چولستان'' کہا جاتا ہے جو ترکی لفظ چیلستان سے اخذ ہوا ہے جو صحرائے بے آب و گیاہ کے لیے بولا جاتا ہے اسی جگہ تباہ شدہ شہروں، ماضی کی عظیم مہذب بستیوں اور بلند مرتبت انسانی تہذیبوں کے جابجا نشانات ملتے ہیں۔ چنانچہ صحرائے چولستان میں مشرق کی طرف دلبر سے ڈیراوڑ تک مختلف مقامات پر جو ٹیلے ہیں ان کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ یہ راجہ واہن کا وطن تھا، مشہور محقق و جغرافیہ دان سر آرل لھیٹین نے ڈیراوڑ تک کے کھنڈرات کی تحقیق کے سلسلے میں جغرافیکل جرنل میں رائے دیتے ہوئے لکھا کہ خشک دریائے ہاکڑہ پر آثار قدیمہ وادی سندھ کے ہم عصر ہیں۔ لیکن ہاکڑہ کے آثار قدیمہ ہنوز تحقیق طلب ہیں۔ انگریز محققین کرنل منجن، سر آرل سٹائن، اطالوی محقق ڈاکٹر تاتوری، امریکی ماہر آثار قدیمہ پروفیسر ہنری فیلڈ اور دو پاکستانی معتبر نام مراد شاہ گردیزی اور ڈاکٹر رفیق مغل نے بہاولپور کے خشک شدہ دریائے ہاکڑہ کی وادی میں قدیم گمشدہ تہذیبوں کے اسرار و رموز کو سمجھنے اور اہل علم تک پہنچانے میں بڑی جانفشانی سے کام کیا جس کے نتیجے میں چار سو سے زائد ایسے مقامات کی تفصیلات ریکارڈ کی گئیں جن کا تعلق ۱۰۰۰ سے ۴۰۰۰ سال قبل مسیح کے زمانے سے تھا۔ اس سروے کے دوران صحرائے چولستان میں گنویری والا کے مقام پر موہنجوداڑو جتنا وسیع وعریض اور اسی طرز پر بسائے ہوئے قدیم شہر کے آثار کو اجاگر کر کے محققین کو ایک نئی جہت دی نیز ہڑپہ کے رقبے کے مساوی دو نئے شہر جو دیراوڑ کے نزدیک تھے دریافت کیے[۲۸] اور اس طرح اس نظریے کو ثبوت فراہم کر دیا کہ جو موہنجوداڑو اور ہڑپہ میں پروان چڑھنے والی تہذیب کا مرکز بہاولپور تھا۔

اس سروے کا مزید گہرائی سے مطالعہ کرنے سے یہ امر بھی واضح ہوتا ہے کہ چار سو مقامات میں سے کم و بیش تین سو مقامات اس تہذیب کے مختلف ارتقائی مدارج کے آئینہ دار ہیں جن سے اس تہذیب کے ظہور، فروغ اور ارتقاء کو باآسانی سمجھا جا سکتا ہے ۲۴ مقامات ایسے ہیں جو چار ہزار قبل مسیح کے زمانہ سے متعلق ہیں اور جن کی قدامت ڈھری ضلع ڈیرہ اسماعیل خانے سے بھی زیادہ ہے ان اثرات کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاشرہ جمہور پسند تھا جس میں طبقاتی درجہ بندی نہ ہونے کے برابر تھی کیونکہ میسوپوٹیمیا کے طرز کے شاہی محلات کا وجود نظر نہیں آیا۔ معاشرہ امن وسکون کا گہوارہ تھا کیونکہ جنگی آلات کا وجود نہیں ملا۔ اناج گھروں کی موجودگی اعلیٰ درجے کی زراعت کا مظہر ہے۔ بڑے بڑے جنگلات کا سراغ بھی ملتا ہے کیونکہ حاصل ہونے والی مہروں پر چیتا، گینڈا، ہاتھی اور زیبرا کی تصاویر ملی ہیں اس طرح مگرمچھ، کچھوا اور مچھلی کی شبیہہ کی بھی مہریں دستیاب ہوئی ہیں۔ اس دور کے سنگتراشی کے نمونے اعلیٰ تمدن کے عکاس ہیں ۔دستیاب شدہ نمونوں کو ماہرین ومحققین نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ رواجی یا تقلیدی جس کی بہترین مثال ریتلے پتھر پر بنی ہوئی بادشاہ پرلٹ اور رقاصہ دیوداسی کی مورتیاں جن کا سراغ ہمیں ہڑپہ میں ملتا ہے۔

۲۔ یونانی اثرات سے متصف سنگتراشی جو مختلف انسانی اور جانوروں کے مجسموں کی شکل میں دستیاب ہوئی[۲۹]۔

ہڑپائی تہذیب کے ان کھنڈرات کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ مذکورہ تہذیب کے جنم سے لے کر عروج و زوال تک ہر مرحلے کے اثرات یہاں نظر

آتے ہیں۔ کوٹ ڈیجی سے متعلق اثرات ابتدائی تمدن کے عکاس ہیں یہاں چڑھاوے چڑھانے کے لیے اور لمبے اور چپٹی قسم کے سلنڈر اور ذخیرہ کرنے والے سرخ رنگ کے پتلے جسم والے جار وغیرہ[۳۰]۔ لیکن جب ڈیراوڑ کے شمال سے مشرق و جنوب مغرب کی طرف آبادیوں نے منتقل ہونا شروع کیا تو تمدن نے ارتقاء کی طرف تیزی سے بڑھنا شروع کیا۔ جس کا ثبوت تعداد، احاطہ اور بلندی میں اضافے سے ملتا ہے۔ اسی طرح ان آبادیوں میں صنعتی کالونیاں عام رہائشی آبادیوں سے دور اور ممتاز نظر آتی ہیں۔ نیز صنعت مٹی سے نکل کر دھاتی مصنوعات کی طرف ترقی کرتی گئی۔ بعد ازاں اس کی حد بندی بھی نظر آئی۔ چنانچہ ظروف اور مٹی کی مصنوعات کی کالونیاں نہ صرف رہائشی علاقوں سے ہٹ کر تھیں بلکہ مختلف صنعتوں کے زون بھی علیحدہ علیحدہ ہو گئے[۳۱] جس کو جدید طرز سمجھا جاتا ہے۔ یہ نشانات چنو ڈیرو، روہڑی اور لوتھل سے برآمد ہو چکے ہیں۔ نیز آبادیوں کے سراغ ڈیراوڑ اور فورٹ عباس کے درمیان واقع ہیں جس سے اس امر کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہاں کے باسیوں میں سوچنے، سمجھنے اور غور وفکر کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں اور بلا شبہ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش کی طرف مائل تھے اور انھوں نے نسل آدم اور حوا کے تہذیبی اور قدیمی ارتقاء میں تاریخ ساز کردار ادا کیا۔

ان کھنڈرات کے مشاہدے سے ایک اہم پہلو یہ بھی اجاگر ہوتا ہے کہ اس دور کی عبادت گاہوں پر کماحقہ روشنی نہیں پڑتی۔ اگرچہ بعد ازاں بدھ کے مجسمے ضرور نظر آئے ہیں اور تاحال ان کا سلسلہ جاری ہے۔ سوئی دھار سے ایک مجسمہ جنوری ۱۹۷۲ء میں ملا جو ساڑھے سات انچ طویل، ساڑھے انچ بلند اور چار انچ موٹا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ہے جو ایک غیر معمولی بات ہے۔ دھاری دھار ڈھیلا لباس اور تسلی دینے کے لیے دایاں ہاتھ اٹھا ہوا ہے اور گھنگریالے بالوں کو کنگھی کر کے کچھ پیچھے کیا گیا ہے۔ مجسمے کے بائیں جانب درج حروف پر ایسے رسم الخط ہیں جو تقریباً پانچویں صدی عیسوی کے معلوم ہوتے ہیں، لفظوں کی تصویر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ ساگھا میتیا ہے جس کے معنی ہیں ساگھا مٹی کا[۳۲]۔

صدیوں پر پھیلے ہوئے انسانی ارتقاء کی امین اس سرزمین پر انگنت بستیاں معرض وجود میں آئیں، اگرچہ یہ بستیاں استبداد زمانہ کے ہاتھوں اپنا وجود کھو بیٹھیں لیکن یہ امر اپنی مسلمہ ہے کہ ان کے مطالعے سے انسان اپنے ارتقائی سفر کے مدارج سے آگاہ ہوا۔ چنانچہ سر مور ٹیمر وھیلر، ڈاکٹر......، سر آرل سٹائن، مسٹر کے گھوش، مسٹر ہنری فیلڈ، کرنل ناڈ، کرنل منچن، مسٹر ڈیڈارس، ڈاکٹر رفیق مغل اور دیگر ماہرین علم آثار قدیمہ سے بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے تحقیق و جستجو کر کے جن بستیوں کے آثار دریافت کیے ان میں صادق آباد کا قصبہ سنجر پور سے ڈیڑھ کلو میٹر دور ہڑ کے کنارے وادی ہاکڑہ کی قدیم ترین بستی کے نشانات ایک بلند ٹیلے کی شکل میں موجود ہیں جس کو سرواہی کا نام دیا گیا ہے۔ کرنل منچن کی تحقیق اور کھدائی کے نتیجے میں قصبہ قائم پور سے مشرق کی سمت تقریباً ۴ کلومیٹر کے فاصلے پر ٹبہ رائیکا کے مقام پر ایک شہر کی باقیات سامنے آئیں یہ مقام اس قدر قدیم ہے کہ اس کے بارے میں اس سے قبل کسی محقق و معرف نے قلم نہیں اٹھایا۔ بعد ازاں ۱۹۲۵ء میں یہاں بہاولپور کنال کی کھدائی کے دوران سکے بھی دستیاب ہوئے جو اس شہر کے متمدن ہونے کی گواہی ہے محکمہ آثار قدیمہ نے رپورٹ دی کہ مذکورہ سکے مہاراجہ کشن کے عہد سے متعلق تھے[۳۳]، الغرض یہ شہر قدامت کے ساتھ اپنے متمدن ہونے کا بھی ثبوت رکھتا ہے۔

سر مور ٹیمر وھیلر اور سر آرل سٹائن کی علمی بصیرت نے نہر ڈیزرٹ برانچ پر واقع نہری بنگلہ کڑوالا سے جنوب کی طرف ڈیڑھ کلومیٹر آگے ایک شہر کو ہڑپہ کے ہمعصر قرار دیا ہے، یہ ان مقامات میں سے ایک ہے۔ جن کی چولستان میں کھدائی کی سفارش سر مور ٹیمر وھیلر نے کی تھی[۳۴]۔

ضلع بہاولنگر میں حاصل ساڑہور سے ۸ میل جنوب میں بستی جیجل ساڑھو کے قریب ایک شہر کے نشانات موجود ہیں یہاں کے لوگوں کی شہادتوں کے مطابق یہ شہر موسم برسات میں شکار کھیلنے کے لیے ججہ بھائیاے نے تعمیر کرایا تھا[۳۵]۔ آثار و بیانات سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ یہ علاقہ اس زمانے میں خوشحال بھی تھا اور متمدن بھی۔ آج بھی بارش ہونے کی صورت میں یہاں کے لوگ سونے و چاندی کے سکے تلاش کرنے کے لیے ان ویرانوں کا رخ کرتے ہیں، مقامی حضرات کے بیان کے مطابق یہاں ایک شاندار محل بھی تھا۔ اینٹوں، ٹھیکریوں اور کسی نہ کسی حد تک چار دیواری کے آثارات اس دعوے کے تصدیق کرتے ہیں۔ اس شہر کی وسعت، خوشحالی اور اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دریائے ستلج اس شہر کے ساتھ بہتا تھا جو اس زمانے میں شہری زندگی کی نشو و نما و ارتقا کے لیے سب سے اہم ضرورت تھی جوں جوں دریا راستہ تبدیل کرتا گیا شہر کا ارتقائی عمل متاثر ہوتا چلا گیا اور

اب صورت حال یہ ہے کہ دریا یہاں سے ۱۲ میل شمال میں بہتا ہے اور شہر کے باقیات بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ قلعہ ڈیراوڑ کے قریب جو کھڈ نامی بستی کے نشانات کی اہمیت یہ ہے کہ روایات کے مطابق سکندر اعظم بھی یہاں پہنچا تھا۔ کرنل ناڈ اس روایت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سکندر مقدونی ڈیڈوسار تک پہنچا تھا۔ خیال رہے کہ اطالوی محقق تاتوری کے مطابق یہاں کا مشہور رنگ محل اور قلعہ بھولڑہ کا معمار کھوپلانی تھا[۳۶]۔ بہر حال یہ ایک قدیمی شہر کی باقیات ہیں جس کے دامن میں پوشیدہ تاریخ کے وہ اوراق ہیں جن کی تحقیق ہنوز باقی ہے اور جس کا مطالعہ انسانی تمدن کے ارتقائی عمل میں اس علاقے کا کردار کے موضوع کو جانچنے کے لیے ناگزیر ہے اسی طرح بجنوٹ کے آثارات کے مشاہدات بھی گرانقدر اہمیت کے حامل ہیں۔ کرنل ناڈ کے مطابق یہ بستی راجپوتوں کی قدیم آبادیوں میں سے ہے۔ نیز ایک مضبوط حصار والا شہر ایک بلند و بالا اور ناقابل تسخیر قلعہ اور ایک بیجاسافی دیوی کے مندر کی تعمیر وہ پہلو ہیں جو اس کی اہمیت آشکار کیے ہیں[۳۷]۔

پتن منارہ رحیم یار خان شہر سے قریباً چھ میل جنوب مشرق میں صحرائے چولستان میں صدیوں تک خوشحالی، تمدنی ارتقاء اور عظمت عطا کرنے والے دریائے ہاکڑہ کے کنارے عظیم ماضی کے ورثہ کا امین ہے جہاں اپنے وقت میں علاقے کی اہم ترین بندرگاہ کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ یہ شہر دریا کے اتصال پر واقع ہونے کی وجہ سے نہایت خوشحال تھا، لیکن جوں جوں دریا اپنا راستہ تبدیل کرتا گیا شہر کی رونقیں ختم ہوتی گئیں حتیٰ کہ اعلیٰ تہذیبی اور تمدنی روایات کا امین شہر کھنڈرات میں تبدیل ہوتا گیا۔ یہ شہر میلوں پر پھیلا ہوا تھا۔ درحقیقت محققین کی آرا اور کھنڈرات دیکھ کر بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب میں اس سے زیادہ خوب صورت، ترقی یافتہ، وسیع و عریض اور خوشحال شہر کی باقیات دستیاب نہیں ہوسکیں۔ بدھ مت کا عظیم معبد اس شہر کی فن تعمیر کی عمدگی کا مظہر ہے اسی طرح شہر کے مشرق کی جانب بقول کرنل ناڈ ہندو مندر کی بلندی و پختگی کے آثار اس امر کو ثابت کرتے ہیں شہر صدیوں تک اپنے ارتقائی مدارج طے کرتا چلا گیا۔ نیز اس شہر کی علمی ساکھ اور مذہبی اہمیت کی عکاسی کے لیے یہ شہادت کافی ہے کہ سندھ بیکانیر اور راجھستان کے راجگان یہاں حاضری دینا سعادت سمجھتے تھے اور وادی سندھ کے تاجر اس مندر میں تجارت کا منافع برکت کے لیے از خود جمع کراتے تھے[۳۸]۔ الغرض پتن منارہ کے آثار پر تحقیق مزید سے نہ صرف تمدن کے ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ انسانی تہذیب کی نمو میں اس علاقے کا کردار بھی ابھر کر سامنے آئے گا۔ کیونکہ پتن منارہ اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ اس کا تذکرہ یونانی مورخ پٹالمے کا جغرافیہ کے نقشے میں ملتا ہے جو ۱۵۰ء میں تحریر کیا تھا، محققین کے نزدیک یہ میوسی کینین کا دارالحکومت تھا۔ چینی سیاح ہیون سانگ کی آمد پر یہ اس وقت کے برہمن حکمران کا پایہ تخت تھا۔ آئین اکبری میں سیوستان کی سرکار کے ذیل میں پتن کا تذکرہ آتا ہے جو اس کو ایک پرگنہ کے طور پر ظاہر کرتا ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی سومنات کی مہم پر جاتے ہوئے پتن کے مقام سے گزرا تھا۔ سندھ بیکانیر اور جیسلمیر کے ہندو راجہ ۱۸ ویں صدی کے آغاز تک ہمیشہ شیور اتری کا تہوار منانے آتے تھے۔ یاتریوں کی رہائش کے لیے یہاں ایک عظیم الشان عمارت تھی جس کے وسط میں تالاب پانی اور دودھ سے بھرے رہتے تھے۔ پتن کے متعلق ایک ضرب المثل بھی زبان زد عام ہے۔ ''جیدین سانگے پتن غرق تھیا اوچ بھی نہ ھیئ'' وہ جس ک وجہ سے پتن غرق ہوا اور تباہی سے ہمکنار ہوا وہ بھی اس میں نہیں اس ضرب المثل کے متعلق بہت سے قصے بیان کیے گئے ہیں۔ جس میں قابل ذکرے واقعہ ہے کہ نواب محمد بہاول خان کے عہد (تقریباً ۱۸۸۴) میں یہاں اگر قوام کا ایک جوگی اس مندر کا رکھوالا تھا، جس نے نمک کے ڈھیر میں اپنے آپ کو دفن کر کے خودکشی کر لی۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی سالانہ رپورٹ بابت ۲۶۔۱۹۲۷ء میں پتن کا ذکر موجود ہے اور ساتھ ہی اس میں وہ تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں جو لی گئی تھیں۔ اس رپورٹ میں بہاولپور گزیٹر کے ابتدائی حصہ کو نقل کرنے کے بعد انڈین انکوائری حصہ گیارہ ۱۸۸۳ء کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۱۸۸۳ء میں معلوم ہوا تھا کہ یہ پختہ خشتی عمارت جس کا بہت سا حصہ گر چکا ہے ابھی تک ۲۶ فٹ بلند اور ۱۲ مربع فٹ عرض کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن یہ عمارت اب قطعی منہدم ہو چکی ہے۔ صرف اس عمارت کا ایک برج وہ بھی انتہائی خستہ حالت میں باقی ہے جو زبان حال سے اپنی کسمپرسی کی داستان سنا رہا ہے[۳۹]۔ اسی مقام کے اردگرد بالا تدور، دروازہ کھوکھومٹو اور پھول ڈورہ کے پرانے مقامات قابل دید ہیں۔ ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ انہی ویرانوں میں بہاولپور کے انجینئر مسٹر حسینی کو ایک سکہ ملا تھا جس کو ماہرین آثار قدیمہ لاہور نے انڈو پارتھین سکہ قرار دیا تھا[۴۰]۔

مدفون بستیوں کے آثار کے علاوہ محلات، مقبرہ جات اور قلعے صحیح حالت میں بھی ہیں اور شکستہ بھی، ضلع بہاولنگر میں تحصیل فورٹ عباس میں ایک نہایت قدیم تاریخی قلعہ مروٹ میں بیک وقت بدھ مت، ہندو مت اور اسلام کی عبادت گاہوں کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اس قلعہ میں مندر کی زیارت کے لیے تمام ہندوستان سے زائرین آتے تھے۔ نیز یہاں پر درگاہ شاہ مردان کی قدر و منزلت بھی مسلمہ تھی اور بلا تفریق مذہب یہاں زائرین آتے تھے۔ مسجد میں نصب ایک پتھر پر فارسی میں تحریر اکبر اعظم کے زمانے کی کندہ ہے۔ اسی جگہ مہاراجہ بیکانیر کے محلات بھی اپنے وقت میں شہرت دوام رکھتے تھے۔ لیکن اب نہ وہ محلات ہیں اور نہ وہ عبادت گاہیں جن کا اس زمانے میں شہرہ تھا البتہ منہدم قلعہ کے پرانے کھنڈرات میں نکاسی آب کے آثارات موجود ہیں نیز مشرقی جانب ایک دروازے پر پیلے رنگ کے پتھر موجود ہیں جن پر ہندو دور کے بتوں کے نقش موجود ہیں[۴۱] اور ان کی حفاظت کا بھی معقول انتظام نہیں ہے۔

موجودہ قلعوں میں سب سے بہتر حالت میں قلعہ ڈیراوڑ ہے۔ صدیاں گزرنے کے باوجود اس کی ہیئت اور شان و شوکت قابل دید ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ موجودہ قلعہ والئ جیسلمیر راجہ راول رائے سنگھ نے ایک قدیم قلعہ کو منہدم کر کے تعمیر کرایا تھا جس کو نواب صادق محمد خان اول نے ۱۱۴۶ء میں فتح کیا تھا۔ بعد ازاں یہ ریاست کا پایہ تخت قرار دیا نتیجتاً اس میں خوب صورت محلات تعمیر ہوئے۔ عالیشان دفاتر اور عمال سلطنت کی رہائش گاہیں بھی تعمیر کی گئیں۔ اب اس مقام پر نہ رونقیں ہیں نہ آبادیاں بلکہ قلعہ کی عمارتیں روبہ انہدام ہیں۔ البتہ جامع مسجد دہلی کے مانند ایک پرشکوہ مسجد ہے جو کہ نمازیوں کے نہ ہونے پر مرثیہ خواں ہے۔ وضو خانہ ہے لیکن پانی ندارد[۴۲]، ایک عجیب اتفاق ہے کہ مسجد کی سیڑھیوں پر ایک پتھر ہے جس پر بالکل واضح بابا غلام فرید کا نام ابھر کر سامنے آیا ہے جو بابا کے عقیدتمندوں کے لیے نہایت توجہ کا حامل ہوگیا ہے۔ راقم الحروف کو وہاں کے لوگوں نے بتلایا کہ موجودہ نواب صلاح الدین عباسی کے والد نواب عباس کو معلوم ہوا کہ اس کے بزرگوں کے روحانی پیشوا کا نام سیڑھیوں پر ہے تو انھوں نے اس کو وہاں سے اٹھانے کا حکم دیا تو غلام فرید نے خواب میں آ کر منع کیا اور ہدایت کی کہ میرا نام مسجد کی سیڑھیوں پر ہی بہتر ہے مسجد کے سامنے نہایت قیمتی پتھروں اور عالیشان فانوسوں سے مزین شاہی قبرستان ہے جس پر نہایت ماہر سنگتراشوں اور پچی کاروں نے اپنے فن کے نمائش کی ہے جو اس علاقے کے فن تعمیر کے خوب صورت اور نادر شاہ پارے ہیں۔ اسی جگہ ایک احاطے میں چار مزارات ہیں جن کے متعلق روایت ہے کہ ۷۰۶ ھ میں تبلیغ کے لیے اصحاب رسول ﷺ یہاں تشریف لائے اور ہندوؤں نے ان کو شہید کر دیا[۴۳]۔

اس قلعہ کے علاوہ پتن جان اکھاڑا کے کھنڈرات موجود ہیں اس کا تعمیراتی سامان نہایت معیار کا تھا جو عباسی نوابادئین نے قلعہ دراوڑ کی توسیع کے وقت استعمال کیا۔ بہر حال چولستان میں قلعہ بجنوٹ تک بارہا مقامات ایسے ہیں جو محققین کے لیے بیش بہا خزانے رکھتے ہیں اسی چولستان میں پھولڑہ تعمیر ۱۱۶۶ھ، ولھر، جام نگر یا جام گڑھ، مد گڑھ، موج گڑھ، دین گڑھ چنڑوف (تسخیر ۱۱۷۴ھ) ساہو والا (تسخیر ۱۲۱۵ھ) نواب کوٹ، خیر گڑھ (تسخیر ۱۱۹۸ھ)، رکن پور تسخیر ۱۱۷۳ء اسلام گڑھ اور سردار گڑھ (۱۱۷۷ھ) آج محققین کو دعوت تحقیق دے رہے ہیں[۴۴]۔

بہاولپور کے راستے احمد پور جاتے ہوئے سوئی وھار کا قصبہ ہے جہاں بد خانقاہ کے نشانات موجود ہیں۔ وہاں تانبے کے سکھے ملتے ہیں جس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ مہاراجہ کے تخت نشی ضی کے ۱۲ سال بعد ۱۳۶ میں خانقاہ تعمیر ہوئی، اسی علاقے کے قرب و جوار میں جابجا گزشتہ تہذیبوں کے آثار ملتے ہیں[۴۵]۔ اسی تحصیل احمد پور شرقیہ میں اہم ترین مقام اوچ ہے۔ جو ہزاروں سال سے آباد ہے اور مدینہ الاولیاء کہلاتا ہے اس علاقے میں برصغیر کی پہلی مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اسی علاقے پر سکندر اعظم کے زمانے سے اہل علم اس کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے رہے ہیں[۴۶]۔ اور آج بھی بی بی جیوندی کا مزار قابل دید ہے۔

قلعوں کے آثار تو اس قدر واضح نہیں ہیں لیکن سرزمین بہاولپور میں قدیم محلات اپنے صحیح سالم وجود کے ساتھ موجود ہیں۔ ان میں محل قدیم ایک خاص اہمیت کا حامل ہے فن تعمیر کے علاوہ اس کی ایک تاریخی حیثیت بھی ہے، ۱۷۴۷ء میں بہاول خان اول نے شہر بہاولپور کی بنیاد ڈالی لیکن اپنی رہائش ڈیرا وڑیہ میں ہی رکھی۔ البتہ اس دوران گزٹیئر بہاولپور کے مطابق اس پر بہاول خان ثالث نے احمد پور شرقیہ سے ۳ میل دور ڈیراوڑ کے راستے میں رہائشی

عمارات کے لیے ایک وسیع رقبہ منتخب کیا۔ جہاں محل تعمیر کرایا۔ تاریخ مراد میں درج ہے کہ ۱۸۲۸ء میں نواب محمد خان بہاول ثالث نے کچی اینٹوں سے ایک بلند اور طویل فصیل تعمیر کرائی اس میں اپنے لیے ایک شاندار حویلی عمائدین کے لیے مکانات خوب صورت باغات دربار اور جلوس خاص کے لیے ایک پختہ محل اور نہایت عالیشان مسجد بھی تعمیر کرائی اس طرح ایک نیا شہر تعمیر ہوا جو آج بھی قائم ہے[۴۷]۔

شہر بہاولپور کی بنیاد رکھنے کے ساتھ ہی سرکاری عمارات کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ جو سرکاری دفاتر اور عمال سلطنت کی رہائش دونوں مقاصد کے لیے تھیں۔ چنانچہ پرانی کوٹھی جس میں آج کل ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کا دفتر، چیف منسٹر ہاؤس جس میں آج کل پرانی غلہ منڈی ہے اور نواب کے محل میں فوجی ہسپتال قائم ہے اور سنٹرل لائبریری بہاولپور کی خوب گہری بنیادوں والی عمارت وغیرہ اسی دور میں تعمیر ہوئی۔ یہ عمارات صحرائی فن تعمیر کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں نہایت بلند چھتیں بہت موٹی دیواریں جو اندر سے کچی ہیں تاکہ سردی اور گرمی کی شدت سے زیادہ محفوظ کر سکیں بڑے بڑے روشندان بلند و بالا دروازے آگے پیچھے برآمدے نہایت گہری بنیادیں اور بلند چھتیں صرف خوب صورتی و رعنائی کا سبب ہی نہیں بلکہ پائیداری اور آرام و سکون کا نمونہ بھی ہیں۔ ۱۸۷۲ء میں نواب صادق محمد خان رابع نے بہاولپور کے شمالی جانب بستی ملوک شاہ کے قریب ایک محل تعمیر کرایا اور اس کا نام نور محل رکھا جس کی بلور جیسی سفید اور پرکشش عمارت دور سے بقعہ نور نظر آتی ہے۔ یہ محل جو اطالوی طرز تعمیر کا بہتر نمونہ ہے وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا ہے ریاست کے انجینئر مسٹر ہینن اس کا نقشہ تیار کیا تھا اور اسی کی نگرانی میں ۱۸۷۲ء سے شروع ہو کر ۱۸۷۵ء میں بارہ لاکھ روپے کی لاگت سے اس کی تعمیر مکمل ہوئی تھی۔ عمارت کے وسطی حصے میں ایک نہایت وسیع و عریض ہال ہے۔ چھتوں اور دیواروں پر نقاشی کا خوب صورت کام ہے ہال میں ایک سٹیج بنا ہوا ہے جس پر چاندی کی کرسی نواب صاحب کے بیٹھنے کے لیے تھی۔ ہال اور دوسرے کمروں کی دیواروں کو والیان ریاست کی تصاویر سے مزین کیا گیا تھا۔ اسی زمانے کی تحریر کردہ مختصر تاریخ آج بھی آویزاں ہے جس کو راقم نے خود پڑھا۔ ۱۸۸۱ء میں نواب صادق محمد خان رابع نے دو لاکھ روپے کے مصرف سے بہاولپور میں ایک اور محل تعمیر کرایا جو دولت خانہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے گرداگرد ایک قلعہ نما دیوار تعمیر کرائی تھی۔ اور دیوار کے ساتھ اندر کی طرف ایک خوب صورت باغ لگایا گیا تھا۔ اس کے جوار میں بگھی خانہ، رتھ خانہ اور توشہ خانہ کی عمارت تھیں۔ اور ساتھ ہی چار سو فٹ لمبا اور ایک سو پچاس فٹ چوڑا تالاب تھا جس کے سامنے ایک چھوٹی سی خوب صورت مسجد تھی۔

دراصل دولت خانہ کئی عمارات کا مجموعہ تھا۔ اس محل میں کئی چھوٹے چھوٹے محل تھے جو غالباً نواب صاحب نے اپنی بیگمات کے لیے علیحدہ علیحدہ تعمیر کرائے تھے۔ دولت خانہ میں ایک وسیع و پرکشش ہال ہے اور ان کی طرز تعمیر میں مقامی رنگ کے ساتھ مغربی طرز کی بھی آمیزش ہے، ۱۹۰۴ء میں نواب بہاول خان خامس نے چند اور محلات تعمیر کرنے کے منظوری دی جن میں گلزار محل، نشاط محل اور فرخ محل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ گلزار محل دربار محل کے متصل نہایت خوب صورت عمارات پر مشتمل ہے اس کے کئی دروازے ہیں۔ کمروں کو نفیس فرنیچر اور خوب صور قالینوں سے سجایا گیا ہے۔ دراوزں پر عنابی رنگ مخملی پردے پڑے ہوئے ہیں تمام دیواریں سنگ مرمر کی ہیں۔ چھتوں پر پچی کاری کا کام کیا گیا ہے۔ بڑے بڑے فانوسوں نے اس کی شان و شوکت میں کافی اضافہ کر دیا ہے۔

والیان ریاست بہاولپور کے محلات میں جس محل کو ہر لحاظ خوب صورتی اور وسعت و آرائش میں سب پر فوقیت حاصل ہے وہ صادق گڑھ پیلس ہے جو ڈیرہ نواب صادق محمد خان رابع نے ۱۸۸۲ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس محل کی تعمیر ماہر انجینئروں کی نگرانی میں ہوئی تھی اور اس پر ۱۵ لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔ تعمیر کا کام تقریباً دس تال تک جاری رہا تھا جس کے پایہ تکمیل کو پہنچنے کے بعد ایک شاندار دربار منعقد کر کے اس کا افتتاح کیا گیا تھا۔ اس محل کے گرد ایک نہایت مضبوط چوڑی اور پختہ فصیل ہے۔ محل کے ہر کونے میں ایک برجی اس طرح بنائی گئی ہے گویا پہرہدار سپاہی ایوان شاہی کی حفاظت پر مامور ہیں۔ عمارت کے وسط میں نہایت حسین گنبد ہے۔

بہاولپور کے تمام محلات کا بادی النظر میں جائزہ لیتے ہوئے جو پہلو فوراً نظروں کے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے طرز تعمیر میں اسلامی فکر کی جھلک بہت نمایاں ہے، وہ اطالوی طرظ کا ہو اور خواہ وہ مغربی انداز کا اس میں برجیاں اور گنبد ضرور ہوں گے جو والیان ریاست کی اسلامی تہذیب و تمدن سے

وابستگی کا مظہر ہے۔ یہ امر بھی واضح رہے کہ زیادہ تر محلات نواب صادق محمد خان رابع کے عہد میں تعمیر ہوئے ہیں اس لیے اگر انھیں بہاولپور کا شاہجہان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا انھیں نئی نئی عمارات بنوانے کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ ریاست کی حدود میں محلات کے علاوہ بھی جتنی بھی اہم عمارات ہیں وہ ان کے ہی عہد کی یادگار ہیں۔

بہاولپور کے آثار قدیمہ کی اہمیت صرف اس حد تک ہی نہیں کہ وہ ہڑپائی اور آریائی تہذیب کا ایک فقید المثال مرکز رہا ہے بلکہ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہاں اس تہذیب و تمدن نے اپنے عروج کے منازل طے کے جس نے پورے جنوبی ایشیا میں اپنی بالادستی تسلیم کروائی۔ نیز اسی علاقے سے ان بستیوں نے بھی جنم یا جن کی قدر و منزلت سینکڑوں نہیں ہزاروں برس گزرنے کے بعد بھی ماہرین آثار قدیمہ کے نزدیک مسلم ہے۔ ایسی بستیاں جن کے باسی شستہ جن کا معاشرتی نظام ارفع و اعلیٰ، حفظان صحت سے مزین اور بنیادی سہولتوں کا حامل تھا۔ یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی بنا پر ساری دنیا کو اپنے قدموں تلے روندنے والا سکندر اعظم اسی علاقے کا اسیر ہوگیا۔ اپنے نام سے شہر آباد کیا اور اس کے ہمراہ اہل قلم اور صاحبان فکر و دانش اس علاقے کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔

مدفون بستیوں کے یہ آثارات صدیوں کی دھول میں جن کو ماہرین آثار قدیمہ کی علم بین نظریں ہی دیکھ سکتی ہیں یہاں گرانقدر اور وجیہ و پرشکوہ محلات ناقابل تسخیر قلعے اور عظیم المرتبت شخصیات کے مقبرے ابھی تک صحیح یا شکستہ حالت میں موجود ہیں۔ جو اس علاقے کے صدیوں پر محیط فن تعمیر، بادشاہوں، امیروں اور عوام الناس کے رہن سہن اور عروج مذہبی رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس طرح بیک وقت آرکیالوجی اور تاریخ کے طالب علمین کو ناقابل تردید دستاویزات کی مدد سے ہزاروں سال پر محیط نسل انسانی کے ارتقائی مدارج کو پڑھنے اور جانچنے کے ذرائع مہیا کرتے ہیں اور اس کرۂ ارض پر اس علاقے کی وہ اہمیت تسلیم کروانے کا ذریعہ بنے ہیں جس سے آج تک مجرمانہ حد تک چشم پوشی ہوتی رہی ہے۔

تہذیب و تمدن کا یہ ارتقائی سفر عالمی انسانی ورثہ ہے جس کی حفاظت کی اولین ذمہ داری اہل پاکستان کی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ ذمہ داری کسی سطح پر پوری نہیں ہو رہی، اس علاقے میں موجودہ تعلیمی نظام کے ڈھانچے کے مطابق دو اعلیٰ ترین ادارے بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی ملتان اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں اپنی ذمہ داریاں کما حقہ پوری کر رہے ہیں لیکن دونوں یونیورسٹیوں میں شعبہ آرکیالوجی نہیں ہے۔ میں نیشنل آرکیالوجی کانفرنس کے ذریعے یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ دونوں جامعات میں شعبے فی الفور شروع کیے جائیں۔ اور اس کانفرنس کے پلیٹ فارم سے مذکورہ یونیورسٹیوں کے مقتدر حضرات سے رابطہ کر کے اس کو عملی شکل دی جائے۔ اس میں فنڈ کی قباحت بھی نہیں ہے۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کی حد تک بحیثیت صدر شعبہ تاریخ و مطالعہ پاکستان میں یہ پیشکش کرتا ہوں کہ موجودہ شعبہ کے اساتذہ شعبہ کی موجودہ عمارت میں بلا کسی معاوضہ و اخراجات اس شعبہ کو شروع کر سکتے ہیں اس سے نہ صرف یونیورسٹی کی آمدن میں اضافہ ہوگا بلکہ اس عالمی ورثہ کی آگہی کی جانب ٹھوس اور عملی سطح پر پیش رفت ہوگی۔

گزشتہ صفحات میں جیسے تحریر کیا جا چکا ہے کہ اس علاقے کے چپے چپے پر ماضی کی عظیم الشان تہذیبوں اور معاشروں کے اثرات موجود ہیں آج بھی بارشوں کے بعد وہاں کے باسی طلائی و نقرئی سکوں کو تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس علاقے میں شاندار میوزیم قائم کیے جائیں جہاں ماہرین آثار قدیمہ کی خدمات حاصل کی جائیں اور وہ ان علاقوں سے ان نادر اشیاء کو حاصل کر کے محفوظ کریں۔ لیکن اس پہلو کو بھی کلیتہً نظر انداز کیا گیا ہے۔ بہاولپور میں ایک نہایت خستہ حال میوزیم قائم ہے۔ راقم الحروف ابھی بمشکل ایک ماہ قبل وہاں گیا۔ وہاں ایگزاسٹ فین تک بند تھے اور مجھ جیسا صحرائی باشندہ جس کے قویٰ عمل گرم موسم کے ہی عادی ہیں اس ہال میں کھڑا نہیں ہو سکا۔ میں نے ذمہ داران سے رابطہ کر کے ایگزاسٹ فین چلانے کو کہا تو انھوں نے جواباً بتلایا کہ ایگزاسٹ فین خراب ہے اور اس کو درست کرنے کے لیے ہمارے پاس بجٹ نہیں ہے۔ واضح رہے کہ میرے ساتھ اس وقت ڈائریکٹر لاہور میوزیم بھی موجود تھے۔ چنانچہ ارباب اقتدار سے گزارش ہے کہ وہ اس جانب بھرپور توجہ دیں میوزیم کے فنڈ میں خاطر خواہ اضافہ ہو۔ ان کا دائرہ کار وسیع ہو۔ نادر اشیاء کی خریداری کے ساتھ ساتھ محققین اور سیاحوں کے لیے پرکشش بنانے کے لیے تمام ذرائع استعمال کیے جائیں تاکہ ماضی کے اس عظیم ورثے کی حفاظت کی جا سکے۔

علاقے کی اس اہمیت کے پیش نظر ٹور ازم کو بھی ازسرنو منظم کرے۔ ان علاقوں تک رسائی کو سہل کرنے اور جدید موٹلز قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ موجودہ صورت حال میں کسی بھی سطح کے مطالعے کے لیے حالات تسلی بخش نہیں ہیں۔ ابھی حال میں قلعہ ڈیراوڑ تک پختہ سڑک تعمیر ہوئی ہے۔ لیکن قلعے کے اندر جانے کے لیے پہلے نواب بہاولپور پرنس صلاح الدین عباسی کی اجازت درکار ہوتی ہے۔ جس کا حصول تقریباً ناممکن ہوتا ہے کیونکہ وہ علاقے میں رہتے ہی نہیں۔ ملحقہ قبرستان جو والیان ریاست کے حالات سے آگہی کا مستند ذریعہ ہے کے لیے اجازت تو ویسے ہی نہیں دی جاتی کہ وہاں مدفون خواتین کے بے پردگی ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قبرستان کی قریبی دیوار منہدم ہوگئی ہے جس کی تعمیر کے اخراجات شاہی خاندان برداشت کرتا ہے اور نہ ہی محکمہ آثار قدیمہ یا محکمہ اوقاف، محکمہ ٹورازم کو وادی ہاکڑہ علاقے کی محلات قلعے اور دیگر آثارات کے متعلق دیدہ زیب پمفلٹ کی صورت میں معلومات مہیا کی جائیں۔ یہ لٹریچر پورے پاکستان کے محکمہ ٹورازم کے تمام دفاتر میں موجود ہو تا کہ پاکستان میں داخل ہونے والا سیاح اور ماہر آثار قدیمہ اس عظیم ورثے کے بارے میں نہ صرف آگاہ ہو جائیں بلکہ اس علاقے کو اپنے پروگرام میں شامل کر لیں۔

آخری گزارش یہ ہے کہ جن یونیورسٹیوں میں شعبہ آرکیالوجی ہے وہ ہر سال کم از کم چار یا پانچ طالب علموں کو اس علاقے کے لیے مختص کر دیں۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے لیے ایسے طالب علموں کے لیے مہمان نوازی ایک اعزاز ہوگی۔

مجھے امید واثق ہے کہ ان گزارشات پر ہمدردانہ غور کیا جائے۔ شکریہ

حوالہ جات توضیحات

۱۔ سٹیٹ گزیٹر ۱۹۰۴ء بحوالہ سیّد محمد اشرف علی بہاولپور کی جغرافیائی اہمیت، الزبیر سہ ماہی نمبر ۴، ۱۹۹۴ء بہاولپور، ص ۔ ۹ و سٹیٹ گزیٹر ۱۹۰۴ء و محمد طاہر، خط بہاولپور ایک تاریخ ایک سرگزشت، مطلع نور بہاولپور ۲۰۰۱ ص ۱۰۷۔

۲۔ اوچ نور الزمان (م ن) ۱۹۹۹۵ ص ۶۳ و محمد طاہر بحوالہ سابقہ ص ۱۰۰

۳۔ غلام رسول مہر ۔ تاریخ سندھ، جلد اول، سندھ ادبی بورڈ ۱۹۵۶ء ص ۱۷۳

۴۔ اوچ نورالزمان ۔ بہاولپور تاریخ کے آئینہ میں، الزبیر بحوالہ سابقہ ص ۲۳

۴۔ الف معاہدے کی تفصیل کے لیے دیکھیے

محمد اکبر ملک، بہاولپور میں بحالی صوبہ کی تحریک، ایک تجزیاتی مطالعہ مقالہ پی۔ایچ۔ڈی اسلامیہ یونیورسٹی

۵۔ کے۔یو قریشی و دیگر مدیران، پاکستان نقشہ جات، اسلام آباد ۱۹۷۵ء ص ۲۳ و سید محمد اشرف علی، بحوالہ سابقہ ص ۱۱

۶۔ سید شاہد علی، بہاولپور کی سماجی و علمی تاریخ، مقالہ پی۔ایچ۔ڈی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور ۲۰۰۱ نمبر مطبوعہ، ص ۱۸

۷۔ سید محمد اشرف علی بحوالہ سابقہ ص ۱۱

۸۔ سید محمد اشرف علی ایضاً ص ۱۲

۹۔ سید محمد اشرف علی بحوالہ سابقہ

۱۰۔ محمد عبدالرحمٰن، بہاولپور کے آثار قدیمہ، الزبیر بحوالہ سابقہ ص ۱۲۱

۱۱۔ نورالزمان اوچ، بہاولپور سیاحین کی نظر میں، الزبیر بحوالہ سابقہ ص ۴۴

۱۲۔ ایضاً

۱۳ ایضاً

۱۴۔ ایضاً ص ۴۵

۱۵۔ ایضاً ص ۴۶

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ ایضاً ص ۴۷ و ۴۸

۱۹۔ ایضاً ص ۴۸ و ۴۹

۲۰۔ ایضاً ص ۴۹ و ۵۰

۲۱۔ ایضاً ص، ۵۵ و ۵۶

۲۲۔ ایضاً ص ۵۷

۲۳۔ ایضاً ص ۵۹

۲۴۔ ایضاً ص ۶۰

۲۵۔ صدیق طاہر وادی ہاکڑہ اور اس کے آثار، بہاولپور ۱۹۹۹۳ ص ۳۶

۲۶۔ صاحبزادہ عبدالرسول بہاولپور کا عظیم ماضی، الزبیر آثار قدیمہ نمبر ۲، ۱۹۷۵ بہاولپور ص ۱۶

۲۷۔ ایس۔ ایم شاہد، قدیم ہند کی تاریخ، دوسرا ایڈیشن اسلام آباد ص ۲۴۸

۲۸۔ محمد صدیق طاہر بحوالہ ص ۵ و ۶

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ ڈاکٹر رفیق مغل، مقالہ وادی سندھ پر سیمینار کراچی ۳۰ دسمبر ۱۹۷۹ء ص نمبر ۷

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ ڈاکٹر حسن درانی کا خط صدیق طاہر کے نام مکتوب نمبر ۲۰۔۲، ۲۶، ۷۷، ۱۹۷۸۔۲۳ صدیق طاہر بحوالہ سابقہ ص ۱۶۵

۳۳۔ محمد عبدالرحمٰن بحوالہ سابقہ ص ۱۲۲

۳۴۔ صدیق طاہر حوالہ سابقہ ص ۳۷ ۔ ۵۱

۳۵۔ ایضاً ص ۹۲

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ ایضاً

۳۸۔ ایضاً ۲۶۔۱۲۵، صدیق طاہر بحوالہ سابقہ ص ۹۷۔۹۴، ایس۔ ایم شاہد بحوالہ سابقہ ۸۷ و ۹۳ و ۹۶

۳۹۔ عبدالرحمٰن، بہاولپور کے آثار قدیمہ، الزبیر بحوالہ سابقہ ص ۱۷ و عزیز الرحمٰن، پتن منارہ الزبیر بحوالہ سابقہ ص ۷۸۔۷۶

۴۰۔ محمد عبدالرحمٰن، بحوالہ سابقہ ص ۱۲۶

۴۱۔ عزیز الرحمٰن، فورٹ مروٹ الزبیر بحوالہ سابقہ ص، ۷۲۔۶۹ محمد الرحمٰن بحوالہ سابقہ ص ۱۲۳ و ہنری فیلٹ

۴۲۔ صدیق طاہر بحوالہ سابقہ ص ۱۱۳ و مولوی محمد دین صادق التواریخ (س، ن) بہاولپور ص ۶۳۔۱۶۰

۴۳۔ زاہد علی واسطی سر زمین بہاولپور ملتان ۱۹۹۳ ص ۱۴۱

۴۴۔ محمد عبدالرحمٰن بحوالہ سابقہ ص ۱۲۷

۴۵۔ پرویز صادق بہاولپور میں سندھ دور کے آثار قدیمہ الزبیر بحوالہ سابقہ ص ۱۳۳

۴۶۔ محمد عبدالرحمٰن بحوالہ سابقہ ۱۲۸

۴۷۔ بحوالہ شاہد حسن، شاہی محلات الزبیر بحوالہ سابقہ ۱۷۸

۴۸۔ ایضاً ص ۱۸۱

۴۹۔ ایضاً ص ۱۸۲